41

اگر خدا تعالیٰ کے انعام کے وعدوں کو پورا ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہو تو ہمیشہ انبیاء کی جماعتوں کے نمونہ کو اپنے سامنے رکھو اور اس کے مطابق اپنے اندر تغیر پیدا کرو

(فرمودہ 14 نومبر 1947ء بمقام رتن باغ لاہور)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

''ساڑھے تین سال کی بات ہے کہ مَیں مئی کے مہینہ میں ڈلہوزی گیا اور وہاں مجھے الہام ہوا کہ اِنَّمَا اُنْزِلَتِ السُّوْرَۃُ الْفَاتِحَۃُ لِتَدْمِیْرِ فِتْنَۃِ الدَّجَّالِ۔ سورۂ فاتحہ دجال کے فتنہ کو بیخ وبُن سے اُکھیڑ دینے کے لئے نازل کی گئی ہے۔ یہ تو ہر مسلمان پر واضح بات ہے کہ سورۂ فاتحہ اپنے اندر بہت سی خوبیاں رکھتی ہے۔ وہ قرآن شریف کا ایک خلاصہ ہے اور قرآن کریم کا وہ حصہ جو اس کے بعد آتا ہے اس کی تفسیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کو قرآن کریم کے لکھنے والوں نے پہلی سورۃ قرار نہیں دیا بلکہ پہلی سورۃ سورۂ بقرہ کو قرار دیا ہے۔ اِس لئے کہ اِس کو پہلی سورۃ قرار دینے سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ یہ بھی تفصیلی قرآن کا حصہ ہے۔ حالانکہ وہ قرآن کا حصہ تو ہے مگر تفصیلی قرآن کا حصہ نہیں۔ اس نکتہ کے نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوا ہے اور بعض نے سورۂ فاتحہ کو قرآن کریم سے الگ سمجھا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم سے سورۂ فاتحہ الگ نہیں۔ قرآن نام ہے دو حصوں کا۔ ایک حصہ اجمالی قرآن ہے اور ایک حصہ تفصیلی قرآن ہے۔

اجمالی قرآن سورۂ فاتحہ ہے اور تفصیلی قرآن سورۂ بقرہ سے سورۂ والناس تک ہے۔ یہ دونوں حصے مجموعی طور پر قرآن کہلاتے ہیں۔ جن لوگوں نے سورۂ بقرہ کو پہلی سورۃ سمجھتے ہوئے سورۂ فاتحہ کو قرآن سے الگ سمجھا ہے وہ غلطی کرتے ہیں۔ درحقیقت ایسے ہی لوگوں کے اعتراضات کو لے کر یورپین مصنف اعتراض کر دیا کرتے ہیں کہ قرآن کریم کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے حالانکہ کوئی اختلاف نہیں۔قرآن نام ہے سورۃ فاتحہ کی بِسْمِ اللّٰہ سے لے کر وَ النَّاس کی س تک۔ مگر جو مکمل قرآن ہے اس کا ایک حصہ سورۂ فاتحہ ہے اور ایک حصہ تفصیلی ہے جو سورۂ بقرہ سے وَ النَّاس تک ہے۔ جب خدا نے مجھے فرمایا کہ اِنَّمَا اُنْزِلَتِ السُّوْرَۃُ الْفَاتِحَۃُ لِتَدْمِیْرِ فِتْنَۃِ الدَّجَّالِ ۔تو اس کے یہ معنی تھے کہ سورۂ فاتحہ اپنی ذات میں اور سورۂ فاتحہ کی جو تفصیل ہے وہ بھی۔ کیونکہ وہ بھی انہی مضامین کی حامل ہے جو سورۂ فاتحہ میں پائے جاتے ہیں۔فتنہ دجال کے استیصال کے سامان اپنے اندر رکھتی ہے۔گویا درحقیقت اس کے مفہوم میں یہ امر شامل ہے کہ سورۂ فاتحہ سے لے کر قرآن کریم کے آخر تک فتنۂ دجال کے توڑ دینے کے سامان بہم پہنچائے گئے ہیں۔

فتنہ دجال کے معنی کرنے میں بھی بعض لوگ غلطی کرتے ہیں۔اور وہ سمجھتے ہیں کہ دجّال سے مراد صرف وہ قوم ہے جس کا احادیث میں ذکر آتا ہے اور جس کے متعلق وعدہ تھا کہ وہ ایک خاص زمانہ میں ظاہر ہوگی۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک خاص زمانہ میں ظاہر ہونے والی ایک قوم ہے جس کا نام دجّال ہے۔مگر اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ دجّال ایک لفظ ہے اور اس کے معنی جس پر بھی چسپاں ہونگے وہ دجال ہی کہلائے گا۔مثلاً رنگترہ 1 ایک لفظ ہے۔ہم اگر اپنے ملازم سے کہیں کہ میرے بستر پر ایک رنگترہ پڑا ہے اسے اٹھا لاؤ اور دوسرے دن ہم ملازم کو کہیں کہ بازار سے رنگترہ خرید لاؤ تو کیا وہ نوکر عقلمند کہلائے گا اگر وہ یہ کہے کہ کل آپ نے میرے سامنے کہا تھا کہ بستر پر سے رنگترہ اٹھا لاؤ آج بازار سے مَیں کہاں خرید لاؤں۔ ہر شخص جس کے دماغ میں عقل ہو وہ جانتا ہے کہ بامعنی لفظ ان تمام چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے جن پر اس کے معنی صادق آسکتے ہوں۔پھر کبھی ایک ہی لفظ سے قریب کی چیز کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور کبھی بعید کی چیز کی طرف۔مثلاً کبھی آدمی سے ہم خاص آدمی مراد لیتے ہیں۔مگر اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ باقی آدمیوں کو ہم نے آدمیّت کے دائرہ سے خارج کر دیا ہے۔ بلکہ اس وقت اس خاص کلام کے لحاظ

سے آدمی سے وہ مخصوص آدمی مراد ہوتا ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر ہم کہیں گے کہ آدمی باہر کھڑا ہے اُسے خط دے آؤ۔ تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ زید یا بکر باہر کھڑا ہے اسے خط دے آؤ۔ لیکن اگر دوسرے وقت ہم یہ کہیں کہ بے انتہا آدمی اس مجلس میں جمع ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں ہونگے کہ کل والا آدمی جو دروازہ میں کھڑا تھا اسی قسم کے اور ہزاروں آدمی پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک جگہ لفظِ آدمی ایک خاص آدمی کی طرف اشارہ کر رہا ہوگا اور دوسری جگہ لفظِ آدمی ہزاروں آدمیوں کی طرف اشارہ کر رہا ہوگا۔ جب ہم کہتے ہیں کہ رنگترہ چارپائی پر پڑا ہوا ہے اسے اٹھالاؤ۔ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ رنگترہ کی جنس میں سے ایک عدد پھل جو چارپائی پر پڑا ہے اسے اٹھالاؤ۔ لیکن دوسرے وقت اس لفظ کے استعمال کرنے کے معنی ہوں گے کہ اس جنس کے دوسرے افراد۔ کیونکہ لفظ رنگترہ کے بہت سے افراد ہوتے ہیں۔ جس طرح آم کے بہت سے افراد ہیں، آڑو کے بہت سے افراد ہیں، سیب کے بہت سے افراد ہیں، امرود کے بہت سے افراد ہیں۔ اسی طرح لفظِ عورت کے بہت سے افراد ہیں۔ لفظ بچہ کے بہت سے افراد ہیں۔ عورت بیٹی سے کہتی ہے کہ بچہ رو رہا ہے۔ جاؤ اور اسے گودی میں اٹھاؤ۔ اُس وقت اگر وہ گلی سے کسی بچہ کو اٹھالے اور کہے کہ تم نے صرف بچہ کہا تھا اور بچہ سے یہ بچہ بھی مراد ہو سکتا ہے تو وہ بے وقوف ہی ہوگی۔ لیکن دوسرے وقت جب بچے شرارت کر رہے ہوتے ہیں تو عورت کہتی ہے کہ بچے شرارت کر رہے ہیں انہیں منع کرو۔ اُس وقت اگر وہ یہ کہے کہ یہ عجیب امر ہے کہ کل ایک بچہ کہا تھا اور آج بچے کہتی ہو۔ تو یہ اس کی اپنی حماقت ہوگی۔ کیونکہ جب اس نے بچہ کہا تھا تو اس کے معنی تھے کہ وہ بچہ جس کو تم جانتے ہو۔ اور جب اس نے بچے کہا تو اس کے معنی یہ تھے کہ محلّہ کے بچے یا دوسرے بچے جو شرارت کر رہے ہیں۔ پہلے موقع پر بچے سے مراد خاص بچہ تھا اور دوسرے وقت اس سے مراد عام بچے تھے۔

دجّال کے معنی ہوتے ہیں ملمع سازی کرنے والا، دھوکا بازی کرنے والا، جھوٹ بولنے والا۔ جو قوم بھی ملمع سازی سے کام لیتی ہے، دھوکا بازی کرتی ہے، فریب کاری کا ارتکاب کرتی ہے وہ دجّال ہے۔ پس لفظِ دجّال سے جہاں ایک خاص گروہ مراد ہوگا جو پادریوں کا ہے وہاں دجّال کے لغوی معنوں کے لحاظ سے وہ تمام افراد مراد ہوں گے جو دھوکا بازی کرتے ہیں اور جھوٹ بولتے اور فریب کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جب خدا نے مجھے فرمایا کہ اِنَّمَا اُنْزِلَتِ

اَلسُّوْرَۃُ الْفَاتِحَۃُ لِتَدْمِیْرِ فِتْنَۃِ الدَّجَّالِ ۔ تو ضروری نہیں تھا کہ اس سے صرف عیسائیوں کا فتنہ ہی مراد ہو۔ جب قرآن ساری دنیا کے لئے ہے اور سورۂ فاتحہ قرآن کریم کا خلاصہ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے سارے فتنوں کا علاج سورۂ فاتحہ میں موجود ہے۔ اور اگر دنیا کے سارے فتنوں کا علاج سورۂ فاتحہ میں موجود ہے اور اگر قرآن میں ساری بیماریوں کا علاج موجود ہے کیونکہ وہ تفصیل ہے اور تفصیل میں وہی بات آسکتی ہے جو خلاصہ میں موجود ہو۔ جیسے آم کے درخت میں وہ خصوصیت نہیں آسکتی جو اس کی گٹھلی میں نہ ہو۔ اسی طرح قرآن کریم میں وہ بات نہیں آسکتی جو سورۂ فاتحہ میں نہ ہو۔ اور اگر قرآن سب روحانی بیماریوں کا علاج ہے تو ساری روحانی بیماریوں کا علاج سورۂ فاتحہ میں بھی ہے۔ کیونکہ قرآن تفصیل ہے اور سورۂ فاتحہ اس کا خلاصہ ہے۔ پس جب یہ کہا گیا کہ سورۂ فاتحہ میں دجال کے فتنے کا ردّ ہے تو اس کے معنی درحقیقت یہ تھے کہ تمام قسم کی خرابیاں جو قومی درجہ تک پہنچ جاتی ہیں اور جن میں جھوٹ اور فریب سے کام لیا جاتا ہے اُس کا علاج سورۂ فاتحہ میں موجود ہے۔

کچھ دن ہوئے مَیں دُعا کر رہا تھا کہ متواتر یہ آیات میری زبان پر جاری ہوئیں۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ 2۔ اور یہ آیات بھی سورۂ فاتحہ کی ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس میں ہمیں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ موجودہ فتنہ کا علاج ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے کسی اور کے ہاتھ میں نہیں۔

ہماری جماعت محتاج ہے اس بات کی کہ وہ اُن لوگوں کے راستہ پر چلے جن پر خدا تعالیٰ نے انعام نازل کیا۔ ہماری مصیبتوں کا یہ علاج نہیں کہ ہم افسوس اور حسرت بھرے دل کے ساتھ بیٹھ جائیں۔ ہماری مصیبتوں کا یہ علاج نہیں کہ ہم رونے لگ جائیں۔ ہماری مصیبتوں کا یہ علاج نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور سُستی دکھائیں۔ ہماری مصیبتوں کا یہ علاج نہیں کہ ہم دنیوی تدابیر کریں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیوی تدابیر بھی مصائب کو دور کرنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہیں اور ایک حد تک دنیوی تدابیر اختیار کرنی لازمی ہوتی ہیں۔ مگر دنیوی تدابیر مصیبتوں کا علاج نہیں ہوتیں۔ جس طرح مکان کی دیواروں پر بیل بُوٹے بنائے جاتے ہیں۔ مگر وہ مکان نہیں کہلاتے۔ یہی حال دنیوی تدابیر کا ہوتا ہے۔ یا تم مکان بناتے ہو تو کہتے ہو اس مکان کے

دروازے اور کھڑکیاں اور چھتیں دیودار3 کی بنائی جائیں یا چیل کی بنائی جائیں یا کیل کی بنائی جائیں یا ٹیک4 (TEAK) (یعنی ساگوان) کی بنائی جائیں۔ حالانکہ ٹیک کا بنا ہوا دروازہ بھی دروازہ ہی کہلاتا ہے۔ چیل کا بنا ہوا دروازہ بھی دروازہ ہی کہلاتا ہے۔ کیل کا بنا ہوا دروازہ بھی دروازہ ہی کہلاتا ہے۔ دیودار کا بنا ہوا دروازہ بھی دروازہ ہی کہلاتا ہے۔ ٹیک یا چیل یا کیل یا دیودار کی وجہ سے وہ کوئی نئی چیز نہیں بن جاتی۔ اسی طرح دنیوی سامان بھی محض زیبائش ہوتے ہیں اور ان سامانوں کو اختیار کرنا ایسی ہی بات ہوتی ہے جیسے لکڑی کے لئے ہم یہ تجویز کریں کہ کیل آجائے یا دیار یا چیل اور ٹیک وغیرہ آجائے۔ اصل چیز جس سے دینی سلسلوں کا ارتقاء وابستہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو کسی الٰہی سلسلہ میں داخل ہوں صراط مستقیم پر چلنے والے ہوں اور صراط مستقیم پر جا کر جو لوگ خدا تعالیٰ کے انعام حاصل کر چکے ہوں اُن کے نقش قدم کی اتباع کرنے والے ہوں۔ اگر یہ نیک تغیر ان میں پیدا ہو جائے کہ وہ خدا تعالیٰ کی رضا اختیار کریں، صراطِ مستقیم پر چلیں اور پہلے نیک لوگوں کی نقل کریں تو یقیناً ان کے اندر کامیابی کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور جب ان کے اندر کامیابی کے سامان پیدا ہو جائیں تو باہر کی دنیا میں بھی پیدا ہونے لگ جاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ انسان کی نجات کا ذریعہ پہلے اس کے اندر پیدا ہوتا ہے اور پھر بعد میں بیرونی دنیا میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک الہام ہے جو پہلے کبھی شائع نہیں ہوا کہ "حقِ اولاد در اولاد"۔ یعنی اولاد کا حق اس کے اندر موجود ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس جگہ اولاد سے صرف جسمانی اولاد مراد ہو۔ بلکہ ہر احمدی جس نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قبول کیا وہ آپ کی روحانی اولاد میں شامل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم یہ نہ سمجھو کہ تمہارے لئے کامیابی کے سامان باہر سے پیدا ہونگے۔ بلکہ پہلے یہ سامان خود تمہارے اندر پیدا ہوں گے۔ اور ہم نے ان سامانوں کے پیدا کرنے کے تمام ذرائع مہیا کر دیئے ہیں۔ ہم نے اپنی تعلیمیں تمہارے سامنے کھول کھول کر بیان کر دی ہیں۔ جتنا جتنا تم ان تعلیموں کو اپنی عملی زندگی میں شامل کرتے جاؤ گے اتنا ہی تمہارے لئے بیرونی دنیا میں تغیر پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ گویا تمہارا حق تمہیں بیرونی دنیا سے نہیں ملے گا بلکہ تمہارے اپنے دل کی طاقت سے تمہارا حق تمہیں ملے گا۔ جتنا جتنا تم اپنے دل میں نیک تغیر پیدا کرو گے، جتنی جتنی تم اپنے اندر اصلاحات کرو گے تمہیں یقین رکھنا چاہیئے کہ اسی تغیر اور اسی اصلاح کے مطابق دنیا چکر کھاتی جائے گی۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بیرونی دنیا سے فیض حاصل کرتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو بیرونی دنیا سے فیض حاصل نہیں کرتے بلکہ بیرونی دنیا ان کے مطابق تبدیل کی جاتی ہے۔ انبیاء کی جماعتیں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ دنیا ان کے مطابق بدلی جاتی ہے۔ وہ دنیا کے مطابق نہیں بدلتے۔ اور اگر دنیا کو بدلنے والی بات ان کے اندر نہ ہو تو وہ ایک بیکار وجود ہوتے ہیں اور وہ اتنا بھی فائدہ بخش نہیں ہوتے جتنے وہ لوگ جو دنیا کے مطابق بدلتے ہیں۔ وہ بہرحال دنیا کے اثر کو قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ خواہ وہ اثر اچھا ہو یا بُرا۔ جیسے ایک کڑوی چیز ہے۔ اسے جو بھی کھائے گا اُس کی کڑواہٹ سے متاثر ہوگا۔ لیکن جو چیز دوسرے پر اثر ڈالنے کے لئے پیدا کی گئی ہو جب تک خود اس میں قوتِ متأثرہ نہ ہوگی وہ دوسرے پر اثر نہیں ڈال سکے گی۔ مثلاً انسان کے جسم میں بعض تأثیریں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے جسم میں گرمی ہوتی ہے۔ اگر اسے ٹھنڈے جسم پر رگڑا جائے تو اُس میں بھی گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ امر ظاہر ہے کہ اگر کسی کے اپنے ہاتھ میں گرمی نہیں ہوگی تو خواہ اُسے کتنا بھی کسی دوسری چیز کے پاس رکھا جائے دوسری چیز میں گرمی پیدا نہیں ہوگی۔ پس جو فائدہ کسی چیز کے اندرونی تغیر سے پیدا ہونے والا ہو وہ بہرحال اندرونی تغیر کا محتاج ہوتا ہے جب تک اندر تغیر نہ ہو باہر کوئی اثر ظاہر نہیں ہوسکتا۔

انبیاء کی جماعتیں بھی اِسی قسم میں شامل ہیں جو اندرونی تغیرات کی محتاج ہوتی ہیں۔ وہ دنیا سے متاثر نہیں ہوتیں بلکہ دنیا کو متأثر کرتی ہیں۔ جو چیزیں دنیا سے متأثر ہونے کے لئے پیدا ہوتی ہیں وہ تو بہرحال اسی غرض کے لئے پیدا ہوتی ہیں۔ مگر جو چیزیں متأثر کرنے کے لئے پیدا ہوتی ہیں جب تک خود ان میں قوتِ مؤثرہ نہ ہو وہ کسی کام نہیں آسکتیں۔

پس اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ہماری جماعت کو ہمیشہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کا گروہ اپنے سامنے رکھنا چاہیے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تم میں سے ہر شخص نے تصویر تو نہیں کھینچی ہوگی لیکن دوسروں کو تصویر کھینچتے تم میں سے اکثر نے دیکھا ہوگا۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ ہاتھ میں برش لئے اور سامنے کاغذ یا کپڑا لٹکائے بعض دفعہ دریا یا نہر یا پہاڑ یا ایسے ہی کسی اَور نظارہ کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ اس نظارہ کو دیکھتے جاتے ہیں اور تھوڑی دیر کے

بعد کاغذ یا کپڑے پر برش مارتے جاتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ اُس نظارہ کی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اِس مثال سے تم سمجھ سکتے ہو کہ تصویر کشی کے لئے دوسرے کے سامنے جانا پڑتا اور اس کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ اگر اس مثال کا سمجھنا بعض لوگوں کیلئے مشکل ہو تو فوٹو کے کیمرہ کو تو ہر شخص جانتا ہے۔ گاؤں کے لوگ بھی جانتے ہیں کہ کیمرہ کے اندر فلم بھری ہوئی ہوتی ہے۔ شیشہ ہوتا ہے فوٹو کھینچنے والا۔ دوسرے کو سامنے بیٹھا کر کیمرہ کا منہ کھولتا اور پھر جلدی سے اسے بند کر لیتا ہے اور اس طرح اس کا فوٹو آ جاتا ہے۔ تم میں سے اکثر نے اس طرح اپنے فوٹو کھنچوائے ہونگے بلکہ آجکل شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جس نے کبھی نہ کبھی فوٹو نہ کھنچوایا ہو۔ اور جسے پتہ نہ ہو کہ فوٹو کھینچنے کا کیا طریق ہوتا ہے۔

مصوّر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ اس شخص کو اپنے سامنے بٹھا لیتا ہے جس کی تصویر کھینچنا اس کا مقصد ہوتا ہے۔ پھر اُس کی طرف غور سے دیکھتا ہے۔ ناک بنانی ہو تو اس کے ناک کو دیکھے گا اور پھر کاغذ پر برش مارے گا۔ چہرہ بنانا ہو تو چہرہ دیکھ دیکھ کر برش مارتا جائے گا۔ جہاں نشیب دیکھتا ہے وہاں اُسی طرح کا نشیب بنا دیتا ہے۔ جہاں اُبھار دیکھتا وہاں اُسی قسم کا ابھار پیدا کر دیتا ہے۔ غرض وہ اس چیز کو اپنے سامنے رکھتا ہے جس کی تصویر کھینچنا چاہتا ہے۔ اور فوٹو گرافر اگر کوئی فوٹو کھینچنا چاہتا ہے تو اُسے بھی دوسرے کو کیمرہ کے سامنے کھڑا کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ سامنے کھڑا ہو گا تو اس کا فوٹو آ جائے گا اور اگر سامنے کھڑا نہیں ہو گا تو اس کا فوٹو نہیں آئے گا۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں بھی مومن کو مصوّر قرار دیا گیا ہے۔ اور پہلوں کو مصوّر بنایا گیا ہے۔ مومن اپنے دل پر تصویر کھینچتا ہے۔ مگر کن لوگوں کی؟ اُن لوگوں کی جو پہلے گزر چکے ہیں اور جو خدا تعالیٰ کے انعامات کے وارث بن چکے ہیں۔ وہ دعا کرتا اور روزانہ اللہ تعالیٰ سے التجاء کرتا ہے کہ اے خدا! مجھے سیدھا راستہ دکھا۔ اُن لوگوں کا راستہ جن پر تُو نے انعام کیا۔ یہ امر ظاہر ہے کہ اس جگہ رستہ سے مراد کوئی ظاہری سڑک نہیں جس پر لوگ چل چکے ہوں۔ بلکہ رستہ سے مراد پہلے لوگوں کا رنگ اور ان کا طور طریق ہے۔ یہ مراد نہیں کہ جیسے لاہور سے امرتسر یا لاہور سے گوجرانوالہ سڑک جاتی ہے اور لوگ اُس پر سفر کرتے ہیں۔ اس طرح کی کوئی سڑک اس آیت میں مراد نہیں۔ بلکہ اِس جگہ رستہ سے مراد پہلے بزرگوں کا طور و طریق اور اُن کا راہِ عمل ہے۔ اور مومن کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ روزانہ یہ دعا کیا کرے کہ

الٰہی! مجھے سیدھا طور وطریق بتا۔ اُن لوگوں کا طور وطریق جو تیرے منعم علیہ گروہ میں شامل ہو چکے ہیں۔ گویا مومن اپنے دل پر پہلے لوگوں کی تصویر کھینچتا ہے۔ مگر یہ تصویر اُسی وقت کھینچ سکتا ہے جب وہ لوگ ہر وقت اُس کی آنکھوں کے سامنے رہیں۔ جب تک یہ اُن لوگوں کو اپنے سامنے رکھے گا اُن کی تصویر اپنے دل پر کھینچنے میں کامیاب رہے گا۔ اور جب یہ اُن کو اپنے سامنے نہیں رکھے گا اُن کی تصویر کھینچنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ پس اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ جن کا انجام بخیر ہو گیا، جو آخر تک صداقت پر قائم رہے، جنہوں نے مرتے دم تک خدا تعالیٰ کا دامن نہ چھوڑا اور جن کا نیک اور پاک ہونا یقین کے مرتبہ تک پہنچ گیا۔ اُن کے نقشِ قدم پر چلنے اور اُن کی تصویر اپنے دل پر کھینچنے کی تمہیں پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ زندگی میں تو انسان کے متعلق ہر وقت خطرہ ہو سکتا ہے کہ اُس کا قدم ڈگمگا جائے اور وہ سیدھے راستہ سے منحرف ہو جائے۔ آج نیک ہے تو کل مرتد ہو جائے مگر جو فوت ہو گیا اور ایمان کی حالت میں اللہ تعالیٰ سے جا ملا وہ دوسروں کے لئے ایک نمونہ بن گیا۔ اور اس کی اتباع یقیناً انسان کی نجات اور اُس کی اخروی بہبودی کے لئے ضروری ہو گئی۔ پس اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں ہمیں اِسی امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جب تم کسی نیک جماعت میں داخل ہو تو تم ہمیشہ یہ دعا کیا کرو کہ وہ نیک اور نیک لوگ جو پہلے گزر چکے ہیں اور فوت ہو چکے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مرتد نہیں ہوئے اور اُن کا انجام بخیر ہو گیا ہمیں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی عملی توفیق عطا فرما تا ہمارے اندر بھی نیکی اور تقویٰ پیدا ہو اور ہم بھی تیرے قرب سے متمتع ہوں۔ مگر مغضوب علیھم اور ضالّین نہ بنائیو۔ یعنی وہ لوگ جو گمراہ ہو گئے یا مرتد ہو کر مر گئے۔ خواہ کسی وقت انہوں نے تیرا قُرب ہی کیوں نہ حاصل کیا ہوا ہو اُن جیسا بننے سے ہمیں محفوظ رکھیو۔

یہ ہو سکتا ہے کہ ایک وقت انسان ولی اللہ ہو اور دوسرے وقت ارتداد کے گڑھے میں گر جائے۔ کیا بلعم باعور کا واقعہ لوگوں کو معلوم نہیں۔ تورات میں لکھا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے چلے اور فلسطین کی طرف گئے تو راستہ میں ایک بادشاہت آتی تھی۔ حضرت موسیٰؑ اور آپ کی قوم نے اُس کا مقابلہ کیا اور حضرت موسیٰؑ غالب آ گئے۔ اُس قوم نے اپنے بادشاہ سے کہا کہ بلعم اللہ تعالیٰ کا نہایت پیارا اور صاحبِ الہام انسان ہے آپ اُس سے دعا کرائیں کہ اللہ تعالیٰ

آپ کو موسیٰؑ کے مقابلہ میں فتح بخشے۔ بلعم کے ساتھ خدا تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا اور وہ لوگوں سے بھی کہا کرتا تھا کہ مجھ سے خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ تمہاری دعائیں قبول کی جائیں گی۔ بادشاہ نے بلعم سے درخواست کی اور انہوں نے حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ میں اُس بادشاہ کی کامیابی کے لئے دعا کی۔ دعا کر ہی رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں الہام ہوا کہ اس بادشاہ کے مقابلہ میں ہمارا نبی ہے۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ ہم تمہاری دعا قبول کر کے اُسے تباہ کر دیں۔ بلعم خاموش ہوگیا اور اس نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ مَیں اب دعا نہیں کرسکتا مجھے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جھاڑ پڑتی ہے۔ اُس نے پھر اصرار کیا مگر وہ نہ مانا۔ آخر کسی نے اُس بادشاہ کو ترکیب بتلائی کہ بلعم پر اُس کی بیوی کا بہت اثر ہے اُسے کچھ روپیہ بھجوا دیا جائے تو اس کے کہنے پر ممکن ہے بلعم پھر دعا کے لئے تیار ہو جائے۔ جس طرح آجکل کے لوگ مجسٹریٹوں کی بیویوں کو تحائف بھجوا دیتے ہیں اور وہ زور دے کر اپنے خاوندوں کو اُن کے حق میں فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اِسی طرح بادشاہ کو یہ ترکیب بتلائی گئی۔ چونکہ بالعموم خدا تعالیٰ کے بندے دنیا کمانے میں کم حصہ لیتے ہیں اور اُن کی مالی حالت کمزور ہوتی ہے۔ اِسی قسم کی حالت بلعم کی بھی تھی۔ جب بادشاہ نے اُس کی بیوی کو بہت کچھ روپیہ بھجوا دیا تو اُس نے اپنے خاوند سے کہا کہ ہم کتنی مصیبت برداشت کر رہے تھے اور کس طرح ہم پر فاقے آتے تھے اب بادشاہ نے ہمارے ساتھ اتنا حُسنِ سلوک کیا ہے۔ تم ایک دفعہ میری خاطر موسیٰؑ کے مقابلہ میں دعا کرو۔ خدا کا تمہارے ساتھ وعدہ ہے کہ وہ تمہاری دعا کو قبول کرے گا۔ تمہاری دعا سے اگر موسیٰؑ مر گیا تو بہتر ورنہ اِس گناہ کے متعلق بعد میں توبہ کر لینا۔ وہ بیوی کے کہنے پر ایک پہاڑ کی چٹان پر گئے جہاں سے موسیٰؑ اور اُن کی فوج نظر آتی تھی اور دعا میں مشغول ہوگئے۔ جب دعا کے لئے انہوں نے ہاتھ اٹھائے تو یکدم اُن پر کشفی حالت طاری ہوئی اور انہیں معلوم ہوا کہ اُن کے سینہ میں سے ایک کبوتر نکلا اور ہوا میں پرواز کر گیا ہے۔ اُس کے بعد انہیں الہام ہوا۔ اے بلعم ! تیرے ساتھ ہمارا وعدہ دعاؤں کی قبولیت کا تیرے ایمان کی وجہ سے تھا۔ جب تُو ہمارے ایک برگزیدہ نبی کے مقابلہ میں کھڑا ہوگیا تو ہماری نگاہ میں تیرا ایمان بالکل ذلیل ہوگیا۔ چنانچہ یہ کبوتر جو تیرے سینہ میں سے نکل کر ہوا میں اُڑ گیا ہے یہ تیرا ایمان تھا جو ہمارے پاس آ گیا ہے اور بلعم بے ایمان کی

دعا قبول کرنے کا ہم نے وعدہ نہیں کیا تھا۔

تو دیکھو ایک انسان خواہ کتنا بھی برگزیدہ ہو اگر اُس کا انجام خراب ہو جائے تو اُس کی نقل کر کے ہم نے کیا کرنا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ گو الہام میں غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کے الفاظ نہیں مگر بہر حال یہ الفاظ پہلی آیت کے ساتھ ہی ہیں۔ اور اس طرح ہمیں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جو لوگ ایسی حالت میں مر گئے کہ وہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں شامل نہ تھے وہ بہر حال مغضوب تھے یا ضالّ۔ اور ان کی اتباع انسان کو ذلیل کرنے والی ہے۔

پس مومن کو ہمیشہ اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقِ عمل کو دیکھنا چاہیئے اور غور کرنا چاہیئے کہ انہوں نے ہمارے لئے کیا نمونہ چھوڑا ہے۔ ایک انسان پر مصیبت آتی ہے تو وہ ہر وقت روتا پھرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے ہائے مَیں تباہ ہو گیا، ہائے مَیں برباد ہو گیا۔ اُسے سوچنا اور غور کرنا چاہیئے کہ کیا موسیٰؑ پر مصیبت نہیں آئی۔ کیا عیسیٰؑ پر مصیبت نہیں آئی؟ کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مصیبت نہیں آئی؟ پھر وہ اُن کو کیوں نبی مانتا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک ملک کا وعدہ دیا گیا مگر وہ اُس ملک سے باہر ہی وفات پا گئے۔ کیا موسیٰؑ نعوذ باللہ جھوٹے تھے کہ وہ بغیر اُس ملک میں داخل ہونے کے وفات پا گئے اور اُن کی قوم جنگلوں میں بھٹکتی پھری؟ کیا حضرت عیسیٰؑ نعوذ باللہ جھوٹے تھے جن پر شدید مصائب آئے؟ کیا رام چندرؑ جھوٹے تھے جن کو بارہ برس کا بن باس ملا اور دشمن اُن کی بیوی تک چھین کر لے گیا؟ کیا زرتشتؑ جھوٹے تھے جنہیں ایک لمبی لڑائی لڑنی پڑی اور جس میں انہیں کئی بار شکستیں ہوئیں؟ کیا حضرت نوحؑ جھوٹے تھے جن کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا وہ وطن جس میں اُن کے باپ دادا کی قبریں تھیں۔ حضرت آدمؑ کی قبر بھی وہیں تھی اور اُن کی نشانیاں بھی اسی جگہ تھیں۔ مگر انہیں وطن چھوڑنا پڑا۔ کیا اس مصیبت کی وجہ سے کوئی شخص انہیں جھوٹا کہنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ غرض اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے گروہ کی طرف جب انسان نظر ڈالے گا تو اُسے کئی چیزیں جو اُس کے لئے ٹھوکر کا موجب بن جاتی ہیں ایسی نظر آئیں گی جو اُن میں بھی پائی جائیں گی۔ اور جب وہ دیکھے گا کہ باوجود ان مشکلات کے انبیاء اور اُن کی جماعتوں نے ایمان کا دامن نہ چھوڑا اور وہ کامیابی حاصل کر کے رہے تو اُس کی ہمت بھی بڑھے گی اور وہ مشکلات پر غالب آنے کی

کوشش کرے گا۔ پس اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں یہ بتایا گیا ہے کہ تم گزشتہ انبیاء اور ان کی جماعتوں کے نمونہ کو اپنے سامنے رکھو اور ہر وقت ان کے واقعات کو دیکھتے رہو۔ تم پر اگر مصائب آتے ہیں تو تم دیکھو کہ کیا ایسی ہی مصیبتیں اُن پر نہیں آئیں۔ پھر انہوں نے کیسا ثباتِ قدم دکھایا اور کس طرح اللہ تعالیٰ سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُحد کی جنگ میں زخمی ہو کر ایک گڑھے میں جا پڑے۔ اور صحابہؓ نے سمجھا کہ آپ مارے گئے ہیں تو اُس وقت صحابہؓ کی کیا حالت ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ مارے نہیں گئے۔ سوال یہ ہے کہ صحابہؓ نے کیا سمجھا تھا؟ صحابہؓ یہی سمجھتے تھے کہ آپ شہید ہو چکے ہیں۔ پھر غور کرو اور سوچو کہ جب صحابہؓ نے اُحد کی جنگ میں یہ دیکھا کہ اسلامی لشکر تِتّر بِتّر ہو چکا ہے۔ جب صحابہؓ سمجھتے تھے کہ ہماری عورتیں اور بچے اب صرف آٹھ میل کے فاصلہ پر رہ گئے ہیں اور درمیان میں کوئی لشکر نہیں جو دشمن کے حملہ کو روک سکے۔ جب صحابہؓ کے سامنے تین ہزار کا نہایت زبردست اور تجربہ کار لشکر کھڑا تھا جس نے تمام اسلامی لشکر کو تِتّر بِتّر کر دیا تھا۔ اُس وقت صحابہؓ نے کیا سمجھا تھا؟ اُس وقت اُمید کا 1/100 فیصدی پہلو بھی تو اُن کے سامنے نہیں تھا۔ امید انسان کرتا ہے جتھے پر۔ مگر اُس وقت مسلمانوں کا کوئی جتھا نہیں تھا۔ تمام لشکر تِتّر بِتّر ہو چکا تھا۔ اُمید انسان کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے کسی نبی یا اُس کے کسی برگزیدہ انسان کی موجودگی پر اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ انسان دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ مصائب کو دور فرما دے گا۔ مگر وہ شخص اُن کے نزدیک شہید ہو چکا تھا اور اُس کا مقدس جسم لاشوں کے نیچے پڑا تھا۔ پھر انسان سمجھتا ہے کہ ابھی ہماری اَور فوجیں تیار کھڑی ہیں۔ اگر ایک فوج کو شکست بھی ہوتی ہے تو کیا ہوا۔ مگر اُحد اور مدینہ کے درمیان کوئی اسلامی فوج نہیں تھی اور تمام راستہ خالی پڑا تھا۔ انسان سمجھتا ہے کہ اُس کے شہر کے قلعے محفوظ ہیں۔ مگر مدینہ میں کوئی قلعہ نہ تھا اور مسلمان عورتوں اور بچوں کی حفاظت کا کوئی سامان نہیں تھا۔ پھر کون سی چیز تھی جس نے اُن کو ایمان پر قائم رکھا؟ وہ کون سی بات تھی جس کو مدنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اَفَاْئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ 5۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ خدا تعالیٰ کا وعدہ تھا کہ آپ قتل نہیں ہوں گے۔ مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر ہمارا یہ رسول فوت ہو جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم اپنی ایڑیوں

پر پھر جاؤ گے؟ خدا تعالیٰ نے یہ بات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات کے بعد نہیں کہی بلکہ آپ کی زندگی اور آپ کی موجودگی میں کہی کیونکہ نبی کی سچائی کا اُس کی زندگی میں ہی ثبوت مل جاتا ہے۔ اگر موت کے بعد اُس کی سچائی کا ثبوت ملے تو زندگی میں اُس پر ایمان لانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ اور جب کسی نبی کی سچائی معلوم ہوگئی تو پھر اس کی موت یا اس کا قتل کسی مومن کو ڈگمگا ہی کس طرح سکتا ہے۔ جو چیز ایک دفعہ پرکھ لی گئی، جس کے خالص اور بے عیب ہونے کا مشاہدہ کرلیا گیا، جس کے قیمتی ہونے کا ثبوت مہیا ہوگیا۔ اُسے انسان بہرحال خالص اور بے عیب اور قیمتی ہی قرار دے گا خواہ وہ زندہ ہو یا قید و بند کی مشکلات میں ہو۔ آخر ہم روپیہ کو چاندی کی وجہ سے مانا کرتے ہیں یا اس لئے کہ اُسے چور چرا نہیں سکتا؟ اگر اُسے چور چُرا کر لے جائے گا تب بھی روپیہ روپیہ ہی رہے گا۔ ڈاکو اُسے چھین کر لے جائے گا تب بھی اُس کے روپیہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوگا۔ ہم ایک آم کے درخت کو اس لئے درخت مانتے ہیں کہ کوئی اُسے کاٹ نہیں سکتا یا اس لئے ہم اُسے آم کہتے ہیں کہ ہم نے اُس کا پھل کھایا اور اُس کا مزہ اٹھایا؟ جب ہم نے اُس کا پھل چکھ لیا اور ہم نے یقین کی آنکھ سے دیکھ لیا کہ وہ آم کا درخت ہے تو اس کے بعد خواہ لوگ اُسے جلا دیں، کاٹ دیں، تباہ کر دیں، ہم یہی کہیں گے کہ وہ آم تھا۔ کیونکہ ہم نے خود اُس کا پھل کھایا ہے۔ تو اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ میں یہ بتایا گیا ہے کہ تم پہلے نبیوں اور ان کی جماعتوں کے طریق اپنے سامنے رکھو۔ جن حالات اور مشکلات میں وہ ثابت قدم رہے ہیں اگر انہیں حالات اور مشکلات میں تم بھی ثابت قدم رہتے ہو تو تمہیں اللہ تعالیٰ کا انعام مل جائے گا۔ اور اگر تم یہ چاہو کہ اُن جیسی مشکلات تم پر نہ آئیں تو یہ ایک لغو طریق ہوگا۔ اور ایسا ہی ہوگا جیسے لاہور کے متعلق لطیفہ مشہور ہے کہ ایک ہندو پنڈت شدید سردی کے موسم میں دریائے راوی پر نہانے کے لئے گیا۔ سردی سے وہ کانپ رہا تھا کہ سامنے سے اُسے ایک اَور پنڈت آتا دکھائی دیا۔ پرانے پنڈت علی الصبح دریا پر نہانا ضروری سمجھتے تھے۔ جب اُس نے سامنے سے ایک اَور پنڈت کو آتے دیکھا تو پوچھا کہ کیا تم نہا آئے ہو؟ اُس نے کہا ہاں نہا آیا ہوں۔ کس طرح؟ آج تو بڑی سردی ہے۔ اُس پنڈت نے جواب دیا کہ مَیں بھی سخت ڈر رہا تھا کہ آج زیادہ سردی ہے غسل کس طرح کروں گا۔ آخر ایک تجویز میرے ذہن

میں آئی ۔مَیں نے کنکر اُٹھایا اور اُسے دریا میں یہ کہتے ہوئے پھینک دیا ’’تو راشنان سوموراشنان ۔‘‘ یعنی چل بھئی کنکر تیرا نہانا میرا نہانا ہو گیا۔ یہ کہہ کر مَیں واپس آ گیا۔ اِس پر دوسرا پنڈت وہیں سے مُڑ بیٹھا اور کہنے لگا چل بھئی پھر تیرا نہانا میرا نہانا ہو گیا۔ یہ ایمان بھی کوئی ایمان ہے؟ ہمارا خدا سے صرف اُس وقت تک تعلق ہو جب تک وہ ہمیں لیٹے لیٹے حلوے کھلاتا رہے۔ جہاں آزمائش کا وقت آئے ایمان ختم ہو جائے ۔ایسے ایمان کی کیا قیمت ہوسکتی ہے؟ کیا موسیٰؑ نے ایسا ہی ایمان دکھایا تھا؟ کیا عیسیٰؑ نے ایسا ہی ایمان دکھایا تھا؟ کیا نوحؑ نے ایسا ہی ایمان دکھایا تھا؟ جب خدا نے نوحؑ سے یہ کہا کہ کشتی بنا اور یہاں سے نکل ۔تو آخر نوحؑ کا کوئی گھر تھا یا نہیں؟ اور اُس گھر سے اُنہیں محبت تھی یا نہیں؟ نوحؑ کی کوئی قوم تھی یا نہیں؟ اور اُس قوم سے انہیں محبت تھی یا نہیں؟ نوحؑ کا کوئی شہر تھا یا نہیں اور اُس شہر سے انہیں محبت تھی یا نہیں؟ آخر اُسی شہر میں ایسا خدا رسیدہ انسان تھا کہ تورات میں اُس کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا6۔ ایسے باپ دادا کی قبریں وہاں تھیں ۔مگر خدا نے انہیں یہی حکم دیا کہ اس شہر سے باہر نکل ۔ جب خدا نے انہیں کہا کہ اے نوحؑ ! کشتی بنا اور یہاں سے نکل ۔تو کیا اُس وقت نوحؑ نے یہ کہا تھا کہ آپ اپنی نبوت اپنے گھر رکھیں مَیں تو وطن چھوڑ کر جانے کے لئے تیار نہیں؟ نوحؑ نے یہ نہیں کہا بلکہ وہ کشتی بنا کر چل پڑا اور اس نے اپنے وطن کو ترک کر دیا۔ جب موسیٰؑ کو خدا نے یہ کہا کہ تُو مصر سے نکل تو کیا موسیٰ اُس وقت ناراض ہوا اور اُس نے یہ کہا کہ مَیں تو مصر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں؟ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلسطین میں موسیٰ کے باپ دادا رہتے تھے اور وہ اُس کا وطن ہی تھا۔ کیونکہ اوّل تو اُن کے اصل باپ دادا فلسطین کے نہیں بلکہ عراق کے رہنے والے تھے ۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فلسطین کا وعدہ دیا گیا تھا۔مگر آپ فلسطین کے باشندے نہیں تھے بلکہ آپ اُور کے رہنے والے تھے جو عراق میں ہے۔ جہاں عراق کے دونوں دریا چلتے ہیں ۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر سختی کی گئی اور آپ کو آگ میں ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ سے کہا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔اور وہ فلسطین چلے گئے ۔جس کے متعلق خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا کہ یہ ملک آخر تمہاری اولاد کو دیا جائے گا۔مگر اولاد کے لئے بہر حال یہ ایک نیا ملک تھا۔خواہ اس کے پرانے باپ دادا اسی ملک میں کیوں نہ رہ چکے ہوں۔محض باپ دادا کے رہنے کی وجہ سے کسی ملک سے محبت نہیں ہوسکتی۔اسی

مجلس میں بیسیوں سید ہوں گے، بیسیوں پٹھان اور قریشی اور ایرانی النسل ہوں گے۔ ایرانی النسل لوگوں کے باپ دادا ایران میں تھے۔ پٹھانوں کے افغانستان میں تھے۔ مغلوں کے باپ دادا سمرقند و بخارا میں تھے۔ اب کیا مغلوں اور سیدوں کو پکڑ پکڑ کر سمرقند و بخارا اور عرب میں جا کر چھوڑ دیا جائے تو وہ اس کو اپنے لئے انعام سمجھیں گے یا سزا سمجھیں گے مَیں تو سمجھتا ہوں اگر کسی کو پاکستان سے زبردستی عراق، شام اور فلسطین میں بھجوا دیا جائے اس لئے کہ اُس کے باپ دادا فلسطین کے رہنے والے تھے یا عراق اور شام کے رہنے والے تھے تو اُس کے بیوی بچے روتے ہوئے جائیں گے۔ یہ نہیں سمجھیں گے کہ ہم پر یہ انعام کیا گیا ہے کہ ہمیں اپنے باپ دادا کے ملک میں بھجوا دیا گیا ہے۔ وطن وہی ہوتا ہے جہاں انسان پلتا ہے۔ پرانی باتیں بھول جاتی ہیں۔ وطن اُس کو سمجھا جاتا ہے جہاں انسان رہ رہا ہو۔ اگر ضلع گورداسپور اور جالندھر کے پٹھانوں کو ہی افغانستان بھجوا دیا جائے تو وہ کیا سمجھیں گے؟ افغانستان کے لوگ سمجھیں گے کہ ہندی آ گئے ہیں ان کی خوب خبر لو۔ اور یہاں کے رہنے والے پٹھانوں کو غیر سمجھیں گے۔ یا ہم مغلوں کو اگر کوئی ہندوستان سے نکال کر سمرقند و بخارا لے جائے تو ہمارا کیا حال ہو۔ نہ ہم اُن کی بولی سمجھیں گے نہ وہ ہماری بولی سمجھیں گے اور ہم محض باپ دادا کے رہنے کی وجہ سے سمرقند و بخارا کو اپنا وطن نہیں سمجھیں گے۔ ہم یہی کہیں گے کہ ہمارا وطن ہندوستان ہے کیونکہ ہم نے ہندوستان میں ہی آنکھیں کھولیں اور ہندوستان میں ہی اپنی عمر گزاری۔ اِسی طرح موسیٰؑ کا وطن فلسطین نہیں تھا۔ موسیٰؑ کا وطن مصر تھا۔ موسیٰؑ وہیں بڑھا اور جوان ہوا مگر آخر فرعون کے مظالم سے تنگ آ کر اُسے وہاں سے نکلنا پڑا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا موسیٰؑ کو جب خدا نے یہ کہا تھا کہ اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل تو اُس وقت موسیٰؑ نے یہ کہا تھا کہ آپ اپنی نبوت اپنے گھر میں رکھیں مجھے اگر کچھ دینا ہے تو ہمارے وطن میں دیں، فلسطین نہ بھجوائیں؟ موسیٰؑ نے یہ نہیں کہا کہ جب خدا نے کہا کہ اے موسیٰ! اپنا وطن تُو چھوڑ تو موسیٰؑ نے کہا حضور! مَیں تیار ہوں۔ اور جب خدا نے کہا اے موسیٰ! تجھے اپنا وطن آئندہ فلسطین کو سمجھنا پڑے گا۔ تو موسیٰ نے کہا خدایا! مَیں تیار ہوں کہ مَیں فلسطین کو ہی اپنا وطن سمجھوں گا۔

تو اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں بتایا گیا ہے کہ تم خدا تعالیٰ سے سیدھے راستہ پر چلنے کی دعا کیا کرو اور کہا کرو کہ خدایا! ہمیں وہی کام

کرنے کی توفیق دے جو پہلے نیک اور پاک لوگوں نے کئے۔ اگر ہم اُن تکالیف کو برداشت کرتے ہیں جو پہلے لوگوں نے برداشت کیں تو ہم مومن ہیں۔ اگر ہم وہی قربانیاں کرتے ہیں جو پہلے لوگوں نے کیں تو ہم مومن ہیں۔ اگر ہم نماز اور روزہ اور حج اور زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل پر اُسی طرح عمل کرتے ہیں جس طرح پہلے لوگوں نے عمل کیا تو ہم مومن ہیں۔ اور اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو ہمارا دعویٰ ایمان بالکل بے حقیقت چیز ہے۔ جس طرح مصوّر بار بار اُس نظارہ کو دیکھتا ہے جس کی وہ تصویر کھینچنا چاہتا ہے اور برش سے کاغذ یا کپڑے پر نشان ڈالتا چلا جاتا ہے اس طرح اگر تم بار بار پہلے لوگوں کو دیکھو گے نہیں تو اُن کی تصویر اپنے دل پر کس طرح کھینچ سکو گے۔ جب تک تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے کارناموں کو بار بار اپنے سامنے نہیں لاتے، جب تک تم موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور ابراہیمؑ اور نوحؑ کے کارناموں کو بار بار اپنے سامنے نہیں لاتے اُس وقت تک تم کس طرح اُن کی تصویر اپنے دل پر کھینچ سکتے ہو۔ یہ غلط طریق ہے کہ مشکلات کے آنے پر انبیاء سابقین کا ذکر کر کے یہ کہا جائے کہ دیکھو! خدا نے اُن سے کیا کیا اور انہیں کیسی کامیابیاں بخشیں۔ سوال یہ نہیں کہ خدا نے کیا کیا؟ سوال یہ ہے کہ خدا نے کب کیا؟ تم یہ تو دیکھتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کو مارا مگر تم یہ نہیں دیکھتے کہ کتنے عرصہ کے بعد مارا اور کتنی تکالیف کے بعد اُن پر غلبہ حاصل کیا۔ تم یہ تو دیکھتے ہو کہ موسیٰؑ فلسطین پر قابض ہو گئے مگر تم یہ نہیں دیکھتے کہ کب قابض ہوئے۔ تم یہ تو دیکھتے ہو کہ فرعون کی قوم غرق ہو گئی مگر تم یہ نہیں دیکھتے کہ کب غرق ہوئی۔ تم یہ تو دیکھتے ہو کہ نوحؑ غالب آیا مگر تم یہ نہیں دیکھتے کہ کب غالب آیا۔ نوحؑ گھر سے بے گھر ہو گیا۔ وطن سے بے وطن ہو گیا۔ اپنے باپ دادا کی قبروں کو بھی وہ اپنے پیچھے چھوڑ گیا اور پھر کہیں ایک عرصہ بعد اُسے غلبہ حاصل ہوا۔ ان مثالوں کو اپنے سامنے رکھ کر اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ پر غور کرو اور اپنی کامیابی کے لئے کسی قسم کی شرط نہ لگاؤ بلکہ جس طرح پہلوں نے مصائب پر صبر سے کام لیا اِسی طرح تم بھی مصائب پر صبر سے کام لو۔ اور جس طرح پہلوں نے نیکیوں میں حصہ لیا اسی طرح تم بھی نیکیوں میں حصہ لو۔ اس کے بغیر وہ انعام مل ہی نہیں سکتا جو صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں بیان کیا گیا ہے۔ تم پہلوں کو دیکھو کہ انہوں نے کیا کیا اور کن حالات میں کیا۔ اُس کے

مطابق اپنے اندر تغیر پیدا کرو۔ جب تم یہ دونوں کام کرلو گے تو پھر خدا تعالیٰ کے انعام کا وعدہ بھی تمہارے ساتھ پورا ہو جائے گا۔'' (الفضل 26 نومبر 1947ء)

1: رنگترہ: سنگترہ

2: الفاتحة: 6، 7

3: دیودار: ایک درخت جو عموماً 1000 میٹر سے بلند علاقوں میں اُگتا ہے۔ اس کی لمبائی 40 سے 50 میٹر تک ہوتی ہے۔

4: ٹیک (TEAK): مضبوط درخت جس کی لکڑی تعمیری کاموں، بحری جہازوں اور کشتیوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ ٹیک انڈونیشیا کا قومی درخت ہے۔

5: آل عمران: 145

6: پیدائش باب 6 آیت 9 مطبوعہ بائبل سوسائٹی انارکلی لاہور